تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغازِ سلطنتِ اسلام سے دیگر بلادِ ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اس وقت سے بادشاہ اور اُن کے خاص محل کے انہماکِ مذہبی کی وجہ سے شیعیت، حکومتِ لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی اور خاندانِ اجتہاد عروج پا کے، سلطنت کا اصلی مقنن قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہبِ شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے اِسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں، بلکہ لکھنؤ کی شیعیت، ساری دنیا کی شیعیت سے نئی، نرالی اور عجیب ہو گئی۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امامِ صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امامِ ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے، تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر نہیں، یہاں ہندوؤں کے جنم اسٹمی کے رسوم کے موافق اور زچاخانہ مرتب کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیّدوں کی خوب صورت لڑکیاں لے کے، ائمۂ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں، جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں، تو پھر اُن کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی اور بارھوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگیں۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضب ناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے۔ اور رعب داب اس بلا کا تھا کہ اُن کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے، مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا، دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولی عہدِ سلطنت تک اُس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اُسے گھونسوں اور لاتوں سے

مارتے۔ جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اُس کا بدلا دیگر معززینِ دربار اور اعزّائے شاہی تک سے لے لیا کرتا۔

اِس سے پہلے بادشاہِ اودھ نے مذہبی ارادت و عقیدت سے، دریا کنارے اور موتی محل کے متصل، نجفِ اشرف یعنی روضۂ مطہرۂ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ میں بنوائی اور اس کی روشنی و خدمت کے لیے بہت سا روپیا سرکارِ انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۵۶ھ محمدی (۱۸۴۰ء) میں جب اُن کا انتقال ہوا تو اُسی میں دفن ہوئے۔

(۶)

۱۲۵۶ھ محمدی (۱۸۲۷ء) میں غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، فرماں روایانِ اودھ نواب نہیں، بادشاہ تھے۔ اِس دولت کا آغاز وزارتِ دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست وذی وقعت فرماں روا سب نواب وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب جب کہ اصلی حکومت و سطوت رخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پالٹکس میں اُن لوگوں کا بالکل اثر نہیں باقی رہا تھا، یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے حکمرانانِ اودھ کو بادشاہی عزّت دی تو اپنی پشت پناہی سے اُن کی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی اور انھیں نام ہی کا بادشاہ نہیں، بلکہ حقیقتاً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہیں، ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس عہد میں اودھ کے باہر ان لوگوں کا اثر تو بالکل تھا ہی نہیں۔ خود اپنی قلم رو میں بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ اُن کے ماسبق بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلم رو میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہو سکتا تھا۔ سریر شہریاری

ایک اسٹیج تھا، جس پر جو کچھ ہوتا بہ ظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہیں، مگر اصل میں وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت میں تھے جو پردے کی آڑ میں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانانِ اودھ کی اور ان کے ساتھ قریب قریب سارے وابستگانِ دامنِ دولت کی حس مفقود ہو گئی تھی جس کی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے اور نصیر الدین حیدر کو تو تختِ شاہی ورثے میں ملا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا روپیا، عیش پرستی میں دونوں کا ممد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزوں کو قرض دیا گیا۔ کچھ اُن بتدعہ مذہبی رسموں کی بجا آوری میں صرف ہوا جنھیں بادشاہ اور ان کی ملکاؤں نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجفِ اشرف کی نقل بنوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا۔ اور بغیر اس کے کہ اپنے وَرثہ بہر و بسا کریں، کچھ روپیا انگریزوں کے حوالے کیا کہ اس کے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی داشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک اُن کی قبر پر چراغ روشن ہوتا ہے، مجلسیں ہوتی ہیں، قرآن خوانی ہوتی ہے، اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے، جس کے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔ مگر نصیر الدین حیدر کو ہجومِ عیش میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ ارادت نگر میں انھوں نے ایک کربلا بنوائی جو خود اُن کا مرقد قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں۔ اُن کے زمانے میں نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہیں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی، جس نے علم ہیأت کی طرف توجہ دلائی۔ اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلا درجے کی رصدگاہ قائم کریں۔ چنانچہ اسی

غرض کے لیے ایک کوٹھی نوّاب سعادت علی خاں کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں تعمیر کرائی، جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں تارے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بڑی بڑی دُوربینیں اور اعلا درجے کے آلاتِ رصد جمع کیے گئے۔ اُن کے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور ان کا انتظام و اہتمام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیأت داں تھے مگر لکھنؤ کی یہ رصدگاہ گویا کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک مجہولُ الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ سنہ ۱۲۵۶ محمدی سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا جس کے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُس وقت سے سنہ ۱۲۷ محمدی (سنہ ۱۸۴۷ء) تک جب کہ آخری تاج دارِ اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، یہ رصدگاہ انھی کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکور میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ کوئی ہیأت داں اس خدمت پر مقرر نہیں کیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دُوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے، حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزیٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ، انتزاعِ سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر میں غالباً بلوائیوں نے اُسے تباہ کر دیا۔ کیونکہ احمد اللہ شاہ نے (جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے بڑی مستعدی و گرم جوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی، اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا اور باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اُسی زمانے میں روشن الدولہ نے، جو وزیرِ سلطنت تھے، اپنی خوبصورت اور شان دار کوٹھی تعمیر کرائی۔ جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہیں اس لیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو، قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے، یہ کوٹھی ایک سرکاری جایداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظامِ مملکت کی خرابی تھی۔ بادشاہ کو عیش و عشرت اور ایجاد کردہ دین داری کی رسموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا نظامِ سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم مہدی بلائے گئے۔ وہ منتظم تو اعلا درجے کے تھے، مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنالیں۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ اُن میں نہ مادّہ تھا نہ طبیعت داری، اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا سارا روپیا پانی کی طرح اُڑ گیا اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ بادشاہ اور اُن کی ماں، غازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ منّاجان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اس کو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانوں میں حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

صاحب رزیڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا اور برابر کان کھولتے رہے۔ مگر یہاں کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ نصیر الدین حیدر میں، عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمۂ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں (اچھوتیاں) اور اُن کی ولادت کی تقریبیں، جو اُن کی ماں نے قائم کی تھیں، اُن کو اور زیادہ ترقی دی یہاں تک کہ ولادتِ ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچا خانے میں بیٹھتے چہرے اور حرکات سے وضعِ حمل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے

ولادت، چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھی سے فرصت نہ ملتی، سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریزیڈنٹوں کی نظرِ عنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگراں تھا، کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا، تو انتزاعِ سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ظالم بھی تھے۔ لیکن چوں کہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی، اس لیے اُن کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں۔ بیسیوں عورتوں کو ادنا قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چُنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا، فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جب کہ اندر باہر کے تمام اہلِ دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے، بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار رہتے اور کسی نے زہر دے کے، ۱۲۶۶ محمدی (۱۸۳۷ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔ منّاجان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچّا وارثِ سلطنت بنا کے پیش کیا۔ مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے اُن کے نسلِ شاہی ہونے سے انکار کیا تھا۔ اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خاں مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خاں کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ منّاجان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آ گئیں۔ رزیڈنٹ نے ہزار

روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سُنی اور زبردستی منّا جان کو تخت پر بٹھا دیا جنھوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی، نذریں لیں، اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلا لینا بھی شروع کر دیا بہتوں کے گھر لٹوائے، بعض کو گرفتار کر لیا بعض قتل ہوئے، اور شہر میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اور ان کے اسسٹنٹ فوراً دربار میں پہنچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ منّا جان وارثِ سلطنت نہیں ہو سکتے اور اس میں آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا: بہتر یہی ہے کہ منّا جان تخت کو خالی کر دیں اور نصیر الدّولہ کی تخت نشینی عمل میں آجائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤں سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بلوالی تھی اور اُس نے تخت گاہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عالی شان نے گھڑی ہاتھ میں لی اور کہا: دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے، اس زمانے کے اندر اگر منّا جان تخت سے نہ اتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالاں کہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہیں، اب دو ہی منٹ رہ گئے، اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تنبیہوں کا کسی نے خیال نہ کیا اور یکایک توپوں نے گرّابیں مارنا شروع کیں، آناً فاناً میں تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ مجرا کر رہا تھا، اس میں سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے شیشہ آلات جھنا جھن ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے، مارے جا چکے تو منّا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا، مگر پکڑ لیے گئے۔ غرض بیگم صاحب اور انھیں، دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدّولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہِ اودھ قرار پائے۔ اور منّا جان اور ان کی دادی

سخت حراست میں لکھنؤ سے کان پور اور کان پور سے قلعۂ چنار گڑھ میں بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپے ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ترسٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربے کار تھے۔ زمانے کے سرد و گرم اور دربار کی طفلانہ مزاجیاں دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کیے اور جہاں تک بنا، انتظام کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آچکی تھی اور قویٰ جواب دیتے جاتے تھے تخت پر بیٹھتے ہی انھوں نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلوا کے خلعتِ وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ تب ظہیر الدولہ کو خلعتِ وزارت ہوا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے اور منوّر الدّولہ وزیر قرار پائے۔ جنھوں نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلائے معلّا چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وزیر قرار پائے جو اوروں کے دیکھتے، ذی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹِ انگریزی اور سلطنتِ اودھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے، سرکارِ انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی، اس میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمروِ اودھ یا اس کے جس علاقے میں بدنظمی دیکھے، اُسے جب تک چاہے، اپنے زیرِ انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کیے اور جہاں تک بنا، ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس انھوں نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اُس کے قریب ایک عالی شان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت میں بڑھ جائے۔

اُن دنوں لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اُس کے سواد میں آباد تھے کہ اسے ہندوستان کا بابل کہنا بے جا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اِس مشابہت کو شاید انگریزوں یا کسی اور درباری سے سُن کے، محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دیں اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دیں جو اُن کے نام کو تمام شاہانِ اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ انھوں نے بابل کے مینار یا وہاں کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹا گھر کے پاس تعمیر کرانا شروع کی، جس میں محرابوں کے مدّور حلقے پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقے پر تیسرا حلقہ، غرض یوں ہی تلے اوپر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یوں ہی سات منزلوں تک اُسے بلند کر کے، ایک اتنا بڑا اور اونچا بُرج بنا دیا جائے جو دنیا بھر میں لاجواب ہو اور اس کے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اس کے گرد کی فضا نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام "ست کھنڈا" قرار دیا گیا تھا اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلیں بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے ۱۲۷۱ھ محمدی (۱۸۴۳ء) میں سفرِ آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے میں بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہوں، یا ملک میں بدنظمی کی فریاد بلند ہو، لکھنؤ کو نہایت ہی خوب صورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا (کے) کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر باوجود دو طرفہ عالی شان مکانوں کے، ایک طرف رومی دروازہ، آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اُس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف ست کھنڈا اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اِس نئے امام باڑے کی مختلف سربفلک عمارتیں تھیں اور ان کے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی۔ اِن سب عمارتوں نے مل کے دونوں جانب ایک ایسا خوش نُما اور نظر فریب منظر

پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان میں باشندگانِ شہر کے جتنے مکانات واقع تھے، سب کھد گئے، مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصوّر کیا جاتا ہے۔

(۷)

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریکہ آرائے سریرِ شہریاری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہدِ سلطنت کی تعلیم اعلا درجے کی ہو۔ چنانچہ انھیں علما و فضلا کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اس کے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی کریں، اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا، یہ تھا کہ وہ اور ان کے ساتھ ساری رعایا، جنابِ قبلہ و کعبہ کی حلقہ بگوشِ ارادت بن جائے لیکن ظاہر ہے کہ علمائے دین و مقتدایانِ ملّت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ مدبّرِ سلطنت ہو سکتے ہیں نہ اسٹیٹسمین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی تھی، یہ تھی کہ سیّدوں کی خدمت گزاری کی جائے اور سلطنت کا روپیا، مومنین کی اعانت و دست گیری میں صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور محتاط پرہیزگار فرماں روائے اودھ امجد علی شاہ کی نظر میں اُسی وقت قابلِ اطمینان ہو سکتا تھا جب خود مجتہدُ العصر کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی میں سے لاکھوں روپیا زکوٰۃ کے نام سے ان کی نذر کیا جاتا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمیں انھی کے ہاتھ میں جاتیں۔

امجد علی شاہ کے لیے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھیں اپنے خیال کی پابندیِ شرع سے اِتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسقِ مملکت کی طرف توجہ کریں۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے، سب درہم برہم ہو گئے، اور یہ حالت ہو گئی کہ (قاضی محمد صادق خاں اختر کے